سیاسی اور غیر سیاسی

اسلام

کی بحث

علامہ یوسف القرضاوی

ادارہ معارف اسلامی

عرضِ ناشر

اُمتِ مسلمہ ہمیشہ ہی باطل پرستوں کی یلغار کا مقابلہ کرتی رہی ہے۔ باطل کے پاس اندھی قوّت، بے پناہ وسائل اور پراپیگنڈہ مشینری کا سہارا ہے، لیکن اسلام کے خلاف لگائے جانے والے الزامات میں کوئی دلیل یا وزن نہیں۔ اِس دُنیا کا یہ چلن بھی بہت عجیب ہے کہ اگرچہ سچائی بالآخر اپنے آپ کو منوالیتی ہے اور جھوٹ زمین بوس ہو کے رہتا ہے تاہم عوام الناس کی ایک بڑی تعداد کافی عرصے تک جھوٹے پراپیگنڈے کا شکار ہو کر مضحکہ خیز مغالطوں کو حق گردانتی رہتی ہے۔

دورِ جدید میں اسلام دُشمن قوّتوں کو اسلام بطورِ پوجا پاٹ کے ایک مذہب کے تو قبول ہے مگر اُسے طریقِ زندگی، نظامِ حیات اور متداول قوّتوں کے مقابلے پر ایک متبادل ریاستی ڈھانچے کے طور پر قبول کرنے کو وہ تیار نہیں۔ محض پرستش اور پوجا پاٹ کے طور پر قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت اور بدھ مت کی طرح اسلام بھی ایک مذہب ہے۔ اسلام کے خلاف مسموم پراپیگنڈہ کرنے کے لیے مختلف قسم کے لغو الزامات لگائے جاتے ہیں، مثلاً جہادی اسلام، انتہا پسندانہ اسلام، دہشت گردی کا حامی اسلام۔ اِسی طرح 'سیاسی اسلام' بھی اسلام دُشمنوں کو خطرے کی گھنٹی معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کا سیاست سے کیا تعلق۔

قرآن وسُنّت میں اِن تمام سوالوں کا جواب موجود ہے۔ دورِ جدید کے مجاہد صفت عالمِ دِین اور مجتہد، امام حسن البنا شہید کے تربیت یافتہ اور قدیم وجدید علُوم پر گہری نگاہ رکھنے والے فقیہِ عصر جناب شیخ یوسف القرضاوی اپنے مضامین ومحاضرات میں ان تمام سوالوں کے جواب دیتے رہے ہیں۔ بیسیوں کتابوں کے مصنف یہ مصری نژاد عالمِ دین سالہا سال سے قطر میں مقیم ہیں اور یہاں سے دُنیا بھر کے مسلمانوں کو راہ نمائی فراہم کرتے رہتے ہیں۔ موصوف کی ایک کتاب فتاویٰ معاصرہ دورِ جدید کی ایک بہت اہم دستاویز ہے۔ اِس کتاب کا ایک باب جو

کویت کے معروف مجلّہ المجتمع میں حک واضافے کے ساتھ شائع ہوا تھا، عالم عرب میں بہت پسند کیا گیا۔ اِس کے تراجم دیگر زبانوں میں بھی ہوئے۔ المجتمع سے ہمارے دوست جناب ظہیرالدین بھٹی صاحب نے اِس مضمون کی ایک تلخیص ماہ نامہ ترجمان القرآن کے لیے تیار کی جو جون ۲۰۰۲ء کے ترجمان میں چھپی تھی۔ مضمون میں تلخیص اور بعض دیگر وجوہات سے ایک تشنگی سی محسوس ہوئی تھی۔ بعد میں ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل میں بھی یہ مضمون ۳ر اور ۱۰ر اگست ۲۰۰۷ء کے شماروں میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ ادارہ معارف اسلامی کے سابق ڈائریکٹر محترم جناب چوہدری محمد اسلم سلیمی صاحب نے مشورہ دیا کہ اِس مضمون کو ایک کتابچے کی صورت میں ادارہ معارف اسلامی کے زیر اہتمام چھاپنا چاہیے۔ راقم نے جب اِس مضمون کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ متن اور ترجمے میں اختصار اور ترجمانی کی وجہ سے کچھ کمی اور خلا محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ادارہ معارف اسلامی کے ماہانہ اجلاس میں اِس موضوع پر غور وخوض کر کے طے کیا گیا کہ ادارے کے رفیق علمی مولانا گل زادہ شیر پاؤ اِس ترجمے کو سامنے رکھ کر اصل متن کا نئے سرے سے ترجمہ کریں۔ مولانا گل زادہ صاحب نے ظہیرالدین بھٹی صاحب کے ترجمے کو برقرار رکھتے ہوئے باقی حصوں کا ترجمہ کیا۔ آیات واحادیث کا اصل متن اور مصنف کی طرف سے دیے گئے حواشی شامل کیے اور عنوانات لگا کر ترتیب میں معمولی تبدیلی کی۔ اب ادارہ اِس کتابچے کو شائع کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ اس اہم موضوع پر دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق قرآن وسُنّت کی روشنی میں لکھی گئی یہ سطور ہمارے اردو دان قارئین کے لیے ذہنی یکسوئی، قلبی اطمینان اور موضوع سے متعلق سوالوں کے شافی جوابات کا بہترین ذریعہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ مصنف ممدوح حفظہ اللہ اور مترجمین کو بہترین اجر سے نوازے۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۷ اپریل ۲۰۰۸ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سیاسی اِسلام!

سیکولر ذہن کے حامل تجدّد پسند حلقے اِسلام پر جو الزامات لگاتے ہیں اُن میں سے ایک 'سیاسی اِسلام' کا الزام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصطلاح اِسلامی معاشرے پر زبردستی مسلط کردی گئی ہے۔ اس اصطلاح سے اُن کی مراد وہ اِسلام ہے جو امت مسلمہ کے مسائل کے حل کی طرف توجہ دیتا ہے اور اُن کے داخلی و خارجی تعلقات کو منظم کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ امت مسلمہ ہر قسم کے اجنبی اقتدار سے آزاد ہو جو اس کی گردن پر سوار ہو کر اس کے مادی اور علمی و روحانی امور کو جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اسی طرح یہ اِسلام امت کو مغربی استعمار کے تہذیبی، معاشرتی اور قانونی شکنجے سے نجات دلانا چاہتا ہے تاکہ وہ نئے سرے سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں شریعت الٰہی کو عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو سکے۔

یہ لوگ اِسلام کو یہ نام اس مقصد کے لیے دیتے ہیں کہ لوگوں کو مطلقاً اِسلام سے اور اُن سچے داعیان اِسلام سے متنفر کر دیں جو اِسلام کے جامع مفہوم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ عقیدے، قانون، عبادات، معاملات، دعوت اور حکومت سب کا مجموعہ ہے۔

میں نے بہت پہلے اس الزام کا جواب دیا تھا اور اس اصطلاح کو مسترد کیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ایک لمبا فتویٰ لکھا تھا جو میری کتاب فتاوٰی معاصرۃ، جلد دوم، میں شائع ہوا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں اس میں سے چند سطور پیش کروں۔ میں نے لکھا تھا: ''یہ اصطلاح ناقابل قبول اور غلط ہے''۔ اس کی وجوہات یہ ہیں:

دشمن کی وضع کردہ اصطلاح

سیاسی اِسلام (political islam) کی اصطلاح دشمنانِ اِسلام نے اپنے مذموم مقاصد

کی خاطر وضع کی ہے۔اس کا مقصد اِسلام کے حصے بخرے کرنا اور اسے تقسیم کرنا ہے۔ان لوگوں کے نزدیک اِسلام ایک نہیں..... جیسا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور ہم مسلمان ایمان رکھتے ہیں..... بلکہ 'اِسلام' بہت سے ہیں، متعدد و مختلف اِسلام۔ وہ کبھی اِسلام کو خطوں کے مطابق تقسیم کرتے ہیں: ایشیائی اور افریقی اِسلام۔کبھی اِسلام کو زمانوں کے مطابق الگ الگ کیا جاتا ہے: نبوی اِسلام، خلافتِ راشدہ کا اِسلام، اموی اِسلام، عثمانی اور جدید اِسلام۔کبھی اسلام کو قومیتوں کے لحاظ سے بانٹا جاتا ہے: عربی، ہندی، ترکی اور ملیشیائی اِسلام وغیرہ۔کبھی اسے فرقوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے: سنی اور شیعی اِسلام۔ پھر سنی اِسلام کو کئی مزید ٹکڑوں میں اور شیعی اِسلام کو بھی اسی طرح کئی ٹکڑوں میں بانٹا جاتا ہے۔کبھی سیاسی اِسلام، روحانی اِسلام، زمانی اِسلام اور لاہوتی اِسلام کی ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں۔معلوم نہیں کہ آئندہ اِسلام کی مزید کیا کیا تقسیمیں کی جائیں گی!

سچ تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کی نظر میں یہ سب تقسیمیں مسترد کیے جانے کے قابل ہیں۔ مسلمان کے نزدیک اِسلام صرف ایک ہے، اس کے سوا، کوئی اور اِسلام نہیں۔یہی پہلا اور آخری اِسلام ہے، قرآن وسنت کا دیا ہوا اِسلام۔یہی وہ اِسلام ہے جسے امت کی افضل ترین نسلوں نے، خیر القرون کے بزرگوں، یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام نے سمجھا۔یہی صحیح اِسلام ہے، کھرا، صاف اور اُجلا اِسلام۔قومیتوں اور فرقوں کی آمیزش سے بالکل پاک۔فلسفیوں کی آراو نظریات سے مبرا، جاہلوں اور گمراہوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ، بدعات وخرافات سے خالی، ہر قسم کی پیچیدگیوں سے معرا۔

اِسلام سیاسی ہی ہوتا ہے

اس مقام پر میں اس بات کا کھلم کھلا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اِسلام ہوتا ہی سیاسی ہے: اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اِسلام کا سیاست کے بغیر تصور ہی ممکن نہیں۔اگر آپ اِسلام کو سیاست سے الگ کردیں گے تو آپ اسے کوئی اور مذہب بنادیں گے، بدھ مت یا عیسائیت جیسا۔مگر یہ اِسلام نہیں ہوگا۔اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

اوّلاً: مکمل ضابطۂ حیات

اِسلام پوری زندگی پر توجہ دیتا ہے۔ بہت سے ایسے امور جنھیں سیاسی سمجھا جاتا ہے ان کے متعلق اِسلام واضح ہدایات اور صریحی احکام دیتا ہے۔ اِسلام کوئی لاہوتی عقیدہ یا محض پوجا پاٹ کے کچھ طریقوں کا نام نہیں ہے، یعنی یہ محض انسان اور اس کے رب کے مابین کسی پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں جس کا زندگی کی تنظیم اور معاشرے و ریاست کے امور سے کوئی تعلق نہ ہو، بالکل نہیں۔ اِسلام عقیدہ اور عبادت ہے، یہ اخلاق اور کامل شریعت ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ زندگی کا مکمل و کامل نظام ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ زندگی کے لیے ایسے مبادیات وضع کرتا ہے، ان قواعد وضوابط کی بنیاد رکھتا ہے، وہ قوانین بناتا ہے اور وہ احکامات جاری کرتا ہے جن کا تعلق فرد کی زندگی سے بھی ہوتا ہے اور خاندانی معاملات سے بھی، معاشرتی مسائل سے بھی اور قومی و بین الاقوامی تعلقات سے بھی۔

أ- عبادات اور سیاست

جس شخص نے قرآنِ کریم، سنتِ مطہرہ اور فقہ اِسلامی میں مختلف مکاتبِ فکر کی کتابیں پڑھی ہیں، اسے یہ بات بالکل واضح طور پر معلوم ہے۔ فقہ میں عبادات تک کا شعبہ 'سیاست' سے الگ نہیں۔ مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نماز ترک کرنا، زکوٰۃ نہ دینا، رمضان میں دن کے وقت برسرِ عام کھانا پینا، فریضۂ حج میں لاپروائی کرنا ایسی حرکات ہیں جن پر حکومت قانون کے تحت سزا دیتی ہے، اور اگر کوئی طاقت ور مسلح جتھہ ان فرائض یا ان میں سے کسی ایک کی بجا آوری میں کوتاہی کرے تو اس کے خلاف لڑائی کی جاتی ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف کی تھی۔

ب- نماز اور سیاست

مسلمان تو عین حالتِ نماز میں بھی بحرِ سیاست میں تیر رہا ہوتا ہے۔ وہ نماز میں اُن آیات کی تلاوت کرتا ہے جن میں اُن امور کا بیان ہے جسے لوگ 'سیاسی' کہتے ہیں۔ جو شخص سورۂ مائدہ کی ان

آیات کی تلاوت کرتا ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیتی ہیں اور ان لوگوں کو ظالم، فاسق اور کافر قرار دیتی ہیں جو اللہ کی نازل کی ہوئی تعلیمات کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، تو وہ براہ راست سیاست میں دخل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ .....الظّٰلِمُوْنَ ..... الْفَاسِقُوْنَ (المائدۃ ۵:۴۴-۴۷) جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں..... وہی ظالم ہیں..... وہی فاسق ہیں۔

ممکن ہے کہ اس کو بھی 'انتہا پسندی' کا نام دیا جائے کیونکہ ان آیات کی تلاوت سے ایک شخص رائج الوقت نظام پر ایک الزام لگاتا ہے اور لوگوں کو اس کے خلاف اشتعال دلاتا ہے۔ رائج الوقت نظام میں کفر، ظلم اور فسق کی صفات میں سے ایک یا بیک وقت یہ ساری صفات موجود ہوتی ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ اس شخص کا ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کی ممانعت کرنے والی آیات کی تلاوت کرتا ہے جیسے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (النساء ۴:۱۴۴) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟

اسی طرح خاص طور پر جہری نماز میں قنوت نازلہ (وہ دعا جو آخری رکعت میں، رکوع سے اٹھنے کے بعد کی جاتی ہے) پڑھنے سے زیادہ سیاسی بات کیا ہو سکتی ہے۔ یہ دعا دشمن سے مقابلے، زلزلے، سیلاب یا قحط جیسے مواقع پر مانگی جاتی ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ امام شہید حسن البنّاؒ نے اس شرعی حکم (قنوت نازلہ) پر مصری قوم کو، انگریزوں کے خلاف کیسے آمادہ کیا؟ آپؒ نے روزنامہ اخبار الاخوان المسلمون میں ایک مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ قابض انگریزوں کے خلاف اپنی نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھا کریں۔ آپ نے ایک دعا بھی لکھی تھی اور کہا تھا کہ اسی طرح کی دعا کیا کریں، تاہم آپ نے لوگوں کو ہو بہو یہی دعا کرنے پر اصرار نہیں

کیا تھا۔ ہم لوگوں نے امام البناؒ کی بتائی ہوئی دعا زبانی یاد کر لی تھی جو ہم نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس دعا کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے:

یا اللہ! جہانوں کے پروردگار! خوف زدہ لوگوں کی امان، متکبروں کو ذلیل کرنے والے، جابروں کی گردن توڑنے والے، اے اللہ! تو جانتا ہے کہ ان ظالم و غاصب انگریزوں نے ہماری زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہمارا حق چھینا ہے، ملک میں سرکشی کی ہے، اور اس میں بہت فساد مچا رکھا ہے۔ اے اللہ! ان لوگوں کے مکر و سازش سے ہمیں محفوظ رکھ، ان کی دھار کند کر، ہمارے ملک سے ان کا اقتدار ختم کر۔ ان کی سلطنت کو زوال دے، یا اللہ! اپنے مومن بندوں میں سے کسی پر ان کا بس نہ چلنے دے۔ یا اللہ! ان کو پکڑ، ان کے مددگاروں کو پکڑ، ان کے حامیوں اور ان سے محبت و دوستی رکھنے والوں کو پکڑ۔ ایسے پکڑ جیسے ایک بااختیار صاحبِ اقتدار پکڑتا ہے۔

دیکھیے، کہ ہم عین محرابِ مسجد میں، نماز کے دوران میں، جب پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہوتے تھے، تو سیاست کے میدان میں بھی دخل دے رہے ہوتے تھے۔ یہ ہے اِسلام کا مزاج، کہ اس میں دین، دنیا سے الگ نہیں ہوتا اور نہ دنیا دین سے جدا ہوتی ہے۔ قرآن و سنت اور تاریخ کسی ایسے دین سے ناآشنا ہیں جو مملکت کے بغیر ہو یا ایسی مملکت سے جو دین کے بغیر ہو۔

ج-شعائرِ دِین اور سیاست

علماے اِسلام نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی شہر کے مسلمان ایسی سنتیں چھوڑ دیں جو اِسلام کے شعائر میں سے ہیں، جیسے اذان، ختنہ، نمازِ عیدین، تو انھیں ان سنتوں کی بجا آوری کے لیے کہا جائے گا اور دلائل سے قائل کیا جائے گا۔ ان کے اصرار و انکار پر ان کے خلاف لڑائی کی جائے گی تا آنکہ وہ ان اِسلامی شعائر کو اپنا کر اس جماعت میں آ ملیں جس سے وہ جدا ہو گئے تھے۔

سیاست، تعلیم، نشر و اشاعت، حکومت، مال و دولت، صلح و جنگ، غرض زندگی کے ہر مؤثر شعبے کے بارے میں اِسلام کے قواعد وضوابط اور احکام وہدایات موجود ہیں۔ اِسلام دنیا جہاں سے کٹ کر یا دوسرے نظریات کا خادم اور دوسرے اِزموں کا تابع بن کر رہنے کے لیے نہیں، بلکہ وہ تو قائد اور سردار بن کر رہنے کے لیے آیا ہے۔ یہاں سیدنا مسیحؑ سے منسوب مقولے پر عمل نہیں ہوسکتا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خداوند کا ہے وہ خداوند کو دو۔ اِسلام کا فلسفہ تو اس بنیاد پر قائم ہے کہ قیصر اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ سب خدائے واحد کے لیے ہے۔ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، سب اللہ کی ملکیت ہے۔ اِسلام کے نظریۂ توحید کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمان، اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بناتا ہے نہ ولی وحکمران، جیسا کہ توحید کی سب سے بڑی سورہ، سورۃ الانعام بتاتی ہے۔ عقیدۂ توحید فی الحقیقت حریت، مساوات اور اخوتِ انسانی کے حصول کا انقلابی ذریعہ ہے تاکہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر، ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں اور انسان انسان کی غلامی سے آزاد رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اہل کتاب کے حکمرانوں کے نام خط لکھنے کے بعد، آخر میں یہ آیتِ کریمہ لکھا کرتے تھے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (آل عمران ۳:۶۴) اے نبیؐ، کہو! اے اہلِ کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔

یہ ہے اس بات کا راز کہ مکہ کے سردار اور عرب کے مشرک، روزِ اوّل ہی سے دعوتِ اِسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے کیوں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، حالانکہ صرف لا الٰہ الا اللہ کا پرچم بلند کیا گیا تھا، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کلمے کے پیچھے کیا ہے؟ اور اس کلمے کو پڑھ لینے سے دینی

انقلاب کے پہلو بہ پہلو سماجی اور سیاسی زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی؟

ثانیاً: فریضۂ شہادتِ حق

اِسلام اپنے نظامِ عقائد، اپنی شریعت اور اپنے نظامِ عبادات و تربیت کے ذریعے مسلمان کی شخصیت اس طرح تعمیر کرتا ہے کہ اس کا غیر سیاسی ہونا ممکن نہیں ہوتا اِلّا یہ کہ وہ اِسلام کو غلط سمجھے یا اس کی غلط تعبیر کرے۔ اِسلام مسلمان کے کندھے پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ڈالتا ہے۔ وہ اس فریضے کو مسلمان حکمرانوں اور عوام کے لیے خیر خواہی کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی بات کو حدیث میں مکمل دین کہا گیا ہے[1]۔ قرآن اسے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کہتا ہے اور یہ دونوں دنیا اور آخرت کے خسران سے بچنے کی لازمی شرطوں میں سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اندرونی فساد کا قلع قمع کرنے کی ترغیب دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خارجی جنگ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ افضل الجہاد کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر[2] بہترین جہاد یہ ہے کہ آدمی ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہہ دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ داخلی فساد ہی وہ ذریعہ ہوتا ہے جو خارجی استعمار کا راستہ ہموار کر دیتا ہے۔ اس مقام پر شہادت کو اللہ کے راستے میں اعلیٰ ترین شہادت قرار دیا گیا ہے۔ آپ کا ارشاد

۱- یہ اشارہ ہے حدیث: الدين النصيحة (دین خیر خواہی ہے) کی طرف، جسے امام مسلم نے کتاب الایمان (۵۵) احمد نے المسند (۱۹۶۴۰) اور ابوداؤد نے کتاب الادب (۴۹۴۴) اور کتاب البیعة (۴۱۹۷) میں تمیم داریؓ سے روایت کیا ہے۔

۲- اس حدیث کو امام احمد نے مسند میں روایت کیا ہے۔ دیکھیے حدیث نمبر ۱۱۰۳۵۔ مسند احمد کے محققین اس کی دو نظیریں پیش کر کے کہتے ہیں کہ ان نظیروں کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ بن گئی ہے۔ ابوداؤد نے اس کو کتاب الملاحم (۴۳۴۴) اور ترمذی نے کتاب الفتن (۲۱۷۴) میں ذکر کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس جہت (روایت) سے یہ حدیث غریب ہے۔ ابن ماجہ نے اسے کتاب الفتن میں ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے۔

ہے: سید الشهداء حمزة، ثم رجل قام الی امام جائر فامره و نهاه فقتلهٗ[۳]
شہیدوں کا سردار ایک تو حضرت حمزہؓ ہیں اور اُن کے بعد وہ شخص جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑا ہو، اسے معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور وہ اسے قتل کردے۔

۱۔ ظلم کے خلاف بغاوت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے دل میں اس احساس کا بیج بویا ہے کہ وہ ظلم کو مسترد کریں اور ظالموں سے بغاوت اختیار کریں۔ یہاں تک کہ آپ ؐ نے حضرت ابن مسعودؓ سے مروی دعائے قنوت میں فرمایا:...... اور یہی دعائے قنوت حنفیہ اور بعض دوسرے مذاہب میں معمول بہ ہے کہ نشكرك ولانكفرك، و نخلع و نترك من يفجرك[۴] [ہم تیرا شکر کرتے ہیں، تیری ناشکری نہیں کرتے اور ہم ان لوگوں سے قطع تعلق کر کے انھیں چھوڑ دیتے ہیں جو تیری نافرمانی کرتے ہیں]

اِسلام نے نہایت ہی بلیغانہ انداز میں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ زمین میں مجبور و مقہور بنائے گئے لوگوں کو اُن کی حالت سے نجات دلائی جائے۔ فرمایا: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء۴: ۷۵) آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے۔

اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو اپنا جامِ غضب پلاتا ہے اور اُن پر سخت نکیر کرتا ہے جو ظلم کو قبول کر لیتے

۳- اس حدیث کو حاکم نے المستدرك، کتاب معرفة الصحابة میں ذکر کیا ہے۔ (۳: ۲۱۵) وہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ مگر شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی۔ علامہ البانی نے صحيح الجامع (۳۶۷۵) میں بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۴- اس حدیث کو عبدالرزاق نے المصنّف، کتاب الصلاة (۳: ۱۱۰) میں، ابن ابی شیبہ نے المصنّف، کتاب الصلاة (۲: ۱۰۶) میں اور بیہقی نے السنن الکبریٰ، جماع ابواب صفة الصلاة (۲: ۲۱۰) میں حضرت عمرؓ سے موقوفاً ذکر کیا ہے۔

ہیں اور ایسی جگہ میں اقامت پر راضی ہوتے ہیں جس میں اُن کو ذلیل کیا جارہا ہو اور اُن پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے جارہے ہوں۔ حالانکہ اُن کے پاس قدرت ہو کہ وہ اس جگہ سے نکل کر کسی اور مقام پر ہجرت کر جائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَ تْ مَصِیْرًا o اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا o فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ وَ کَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا (النساء۴: ۹۷-۹۹) جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔

ان مجبور اور کمزور لوگوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر یہ نہیں فرمایا کہ انھیں معاف کر دیا گیا بلکہ فرمایا: عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے۔ ان کی معافی کو اللہ تعالیٰ سے امید کے معنی میں قرار دیا۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس بات پر ملامت کر رہا ہے کہ وہ کسی بھی حد تک ظلم کو مسترد کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور اسے استعمال نہ کریں۔

قرآن کریم ظلم و جبر کے علمبرداروں، جیسے: فرعون، ہامان، قارون اور اُن کے انصار و اعوان کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ ایک مسلمان کا دل ان کو سزا دینے، ان کی سیرت و کردار کا انکار کرنے اور ان کے ظلم و سرکشی کی ناپسندیدگی کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے۔ وہ فکری اور شعوری طور پر اُن لوگوں کو کامیاب و کامران ٹھہراتا ہے جو اِن ظالموں اور جابروں کے ظلم و جبر کا نشانہ بن

کر دنیا سے گئے۔

ب: فریضۂ نہی عن المنکر

قرآن وسنت میں جب اُن لوگوں کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے جو منکر پر خاموش رہتے ہیں اور منکر کا ارتکاب کرنے والوں، خواہ حکمران ہوں یا رعایا، کے بارے میں منفی رویہ اختیار کرتے ہیں تو یہ گفتگو اُن لوگوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے جن کے دلوں میں رتی برابر ایمان بھی موجود ہو۔ قرآن کہتا ہے: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (المائدۃ ۵:۷۸-۷۹) بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، بُرا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ[۵] جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو، تو زبان سے اور اس کی طاقت بھی نہ ہو تو دل سے بدل دے، یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔

***منکر کی حقیقت:** یہ بات درست نہیں ہے کہ منکر کا لفظ زنا، شراب خوری اور اس طرح کے امور تک محدود ہے۔ عوام کی کرامت وشرافت کے ساتھ کھیلنا، انتخابات میں دھاندلی کرنا اور اپنی گواہی (یعنی ووٹ) نہ دینا ایک بڑا منکر ہے، کیونکہ یہ گواہی کو چھپانا ہے۔ اسی طرح نااہل لوگوں کو اپنا حکمران بنانا، عوامی خزانے سے چوری کرنا، ایسے مال کو، جس کی لوگ فرد یا معاشرے

۵- اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الایمان (۴۹) میں، امام احمد نے مسند (۱۱۱۵۰) میں ابوداؤد نے کتاب الصلاۃ (۱۱۴۰) میں، ترمذی نے کتاب الفتن (۲۱۷۲) میں، نسائی نے کتاب الایمان و شرائعه (۵۰۰۸) میں اور ابن ماجہ نے کتاب الفتن (۴۰۱۲) میں ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے۔

کے مفاد میں ضرورت محسوس کر رہے ہوں، ذخیرہ کرنا بھی ایک عظیم منکر ہے۔ لوگوں کو کسی عدالتی حکم کے بغیر حبس بے جا میں رکھنا، جیلوں اور عقوبت خانوں میں لوگوں کو اذیتیں دینا، رشوت کی لین دین کرنا بھی ایک منکر ہے، حکمرانوں کی چاپلوسی اور خوشامد کرنا اور اللہ کے دشمنوں اور امت کے دشمنوں سے دوستی رکھنا تو سب سے بڑا منکر ہے۔

اس طرح منکرات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں جنھیں لوگ خالص سیاسی معاملات سمجھتے ہیں۔ کیا کسی ایسے مسلمان کے لیے، جو اپنے دین کا حریص اور اپنے رب کی رضا کے لیے بے تاب ہو، یہ ممکن ہے کہ وہ خاموش تماشائی بنا رہے یا ان منکرات کے میدان کارزار سے خوف، لالچ یا جان بچانے کے لیے دم دبا کر بھاگ جائے؟

اگر امت مسلمہ میں یہ رویہ ترقی کر جائے تو یہ اس کے پیغام کا اختتام اور اس کی فنا کا فیصلہ ہوگا۔ کیونکہ تب تو یہ کوئی اور امت بن جائے گی۔ یہ وہ امت نہیں ہوگی جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران۳:۱۱۰) دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس صورت حال میں اگر ہم سنتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ وعید سنائی ہے کہ اِذا رأیت امتی تهاب اَن تقول للظالم: یاظالم! فقد تودِّع منهم[٦] ای فقدوا اَهلیة

٦- اس حدیث کو امام احمد نے مسند (٦٥٢١) میں ذکر کیا ہے۔ مسند احمد کے محققین کے بقول اس کی سند ضعیف ہے، مگر اس کے راوی ثقہ اور صحیحین کے راوی ہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ ابوالزبیر کا عبداللہ بن عمرؓ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ یہ بات ابوحاتم نے المراسیل میں کہی ہے۔ ابن معین سے بھی اس طرح کا قول نقل کیا گیا ہے۔ ابن عدی نے الکامل میں ان کا یہ قول نقل کیا کہ ابوالزبیر نے عبداللہ بن عمرؓ سے نہ سماع کیا ہے اور نہ انھیں دیکھا ہے۔ اسے بزار نے المسند (٣٦٢:٦) میں اور حاکم نے المستدرك، کتاب الاحکام میں نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ بیہقی نے اسے السنن الکبرٰی، کتاب الغصب (٩٥:٦) میں عبداللہ بن عمروؓ سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الحیاۃ، جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے بھی خوف کھاتی ہے تو ان کو الوداع ہی کہہ دو۔ (یعنی ان میں زندہ رہنے کی اہلیت ہی نہ رہی)۔

***مسلمان اور نہی عن المنکر:** ایک مسلمان اپنے ایمان کے تقاضے کے طور پر اس بات کا پابند ہے کہ وہ منکر کے معاملے میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار نہ کرے، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ اس معاملے کا تعلق خواہ سیاست سے ہو یا معیشت سے، معاشرت سے یا ثقافت سے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کا مقابلہ کرے اور اگر طاقت ہو تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اور لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت واضح کر کے اس کو تبدیل کرے۔ اگر زبان کے ساتھ تبدیل کرنے سے بھی عاجز ہو تو پھر آخری اور ادنیٰ مرحلے کی طرف آئے گا اور وہ یہ کہ دل سے اس کو بدلنے کی ٹھان لے۔ یہ حدیث کی رو سے ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

***تغییر بالقلب کا مفہوم:** آخری درجے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تغییر بالقلب (دل سے بدلنا) کہا ہے، کیونکہ یہ منکر اور اہل منکر کے خلاف ایک نفسیاتی اور حسی تیاری ہے۔ یہ تیاری بھی محض ایک سلبی چیز نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے۔ اگر یہ سلبی چیز ہوتی تو حدیث میں اسے تغییر (یعنی تبدیلی) نہ کہا جاتا۔

ضمیر کی یہ مسلسل نفسیاتی اور حسی تیاری ایک نہ ایک دن کسی مثبت اقدام کی صورت میں حرکت پذیر ہونا ضروری ہے، یہ حرکت پذیری بعض اوقات ایک عظیم انقلاب اور ایک ایسے دھماکے میں تبدیل ہو جاتی ہے جو باطل اور منکر کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر رکھ دیتی ہے۔ مسلسل دباؤ کے پیٹ سے ایک نہ ایک دن ایک لاوا ابل پڑتا ہے۔ یہ اللہ کی اپنی مخلوق کے بارے میں ایک سنت جاریہ ہے۔ اگر ایک طرف اس حدیث نے اس رویے کو تغییر بالقلب کہا ہے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) روایت کیا ہے اور ہیثمی مجمع الزوائد میں کہتے ہیں: اسے احمد، بزار اور طبرانی نے نقل کیا ہے۔ بزار کی ایک سند ایسی ہے جس کے راوی صحاح کے راوی ہیں۔ مسند احمد کی سند بھی اسی طرح کی ہے مگر اس میں دراصل ایک غلطی واقع ہوتی ہے۔ (۷:۵۳۱)

دوسری حدیث میں اسے جہاد بالقلب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جہاد کا آخری درجہ ہے۔ اس طرح یہ ایمان کا بھی آخری اور سب سے کمزور درجہ ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ ما من نبی بعثه الله فی امة قبلی الا کان لهٗ حواریون و اصحاب یأخذون بسنته و یقتدون بأمره، ثم انها تخلف من بعدهم خُلوف یقولون مالایفعلون، و یفعلون مالا یؤمرون، فمن جاهدهم بیده فهو مؤمن و من جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، و من جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، لیس وراء ذٰلك من الایمان حبة خردل[۷] مجھ سے پہلے کسی قوم میں جو بھی نبی آیا ہے اس کے کچھ جان نثار رہے ہیں اور کچھ ایسے ساتھی جو اُس کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ اس کے بعد کچھ ایسے ناخلف لوگ آتے تھے جو کہتے کچھ، اور کرتے کچھ تھے۔ وہ ایسے ایسے کام کرتے تھے جس کا انھیں حکم نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں سے جس نے ہاتھ کے ساتھ جہاد کیا وہ مؤمن ہے، جس نے زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے، مگر اس سے آگے ذرہ برابر ایمان بھی نہیں ہے۔

***نهی عن المنکر اور اجتماعیت:** بعض اوقات ایک شخص اکیلا ہوتا ہے تو وہ منکر کا مقابلہ کرنے سے عاجز آتا ہے، خصوصاً اس حالت میں کہ منکر کی چنگاریاں چاروں طرف اڑ رہی ہوں، اس کی حرارت شدید ہو اور اس کے علمبردار طاقت ور ہوں۔ یا منکر کا ارتکاب وہ امرا کر رہے ہوں جن کی سب سے پہلے ذمہ داری یہ تھی کہ وہ منکر کے خلاف برسرپیکار ہوتے نہ کہ اس کے علمبردار بن کر اس کے پہرہ دار بن جاتے۔ ایسے موقع پر تو وہ صورت حال ہوتی ہے جو عربی کے اس ضرب المثل میں بیان ہوئی ہے کہ حامیها حرامیها (یعنی کوتوال بنا چور)۔ یا جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

و راعی الشاة یحمی الذئب عنها
فکیف اذا الرعاة لها ذئاب!!

۷- اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الایمان (۵۰) میں اور احمد نے مسند (۴۳۷۹) میں حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔

چرواہے کا کام یہ ہے کہ بھیڑیوں سے بکریوں کی حفاظت کرے، مگر جب چرواہا خود بھیڑیا بن جائے تو بکریوں کا کیا بنے گا۔

ایسے موقع پر منکر کو ختم کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بلاشک وشبہہ ہر شخص کا ایک فریضہ بن جاتا ہے، کیونکہ یہ تعاون علی البر والتقویٰ ہے۔ اس صورت حال میں مختلف تنظیموں، پارٹیوں میں اور مختلف فورمز پر اجتماعیت کے ساتھ کام کرنا اگر ایک طرف لازمی دینی فریضہ ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

***دعوت، حق یا فریضہ!:** جدید فلسفوں اور حقوق انسانی کے اصول وقواعد میں اظہار رائے، مثبت تنقید، اور کسی کے ساتھ دلیل کی بنیاد پر اختلاف، انسانی حقوق میں شمار ہوتا ہے۔ مگر اسلام اس کو ترقی دے کر ایک مقدس فریضے کی حیثیت دیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اس کے بارے میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ گناہگار ٹھیرتا ہے۔ اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ حق اور فریضے میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حق اباحت اور جواز کے دائرے میں ہوتا ہے۔ اس میں انسان کو اختیار ہوتا ہے کہ اسے حاصل کرے یا چھوڑ دے۔ مگر فریضے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس میں کسی معقول عذر کے بغیر انسان کے لیے ترک کا اختیار نہیں ہوتا۔

ج: مسلمانوں کی خیر خواہی

ایک مسلمان کو اُس کے ایمان کا یہ تقاضا ہمیشہ سیاسی بنائے رکھتا ہے کہ اسے دوسروں کی مشکلات اور دکھ درد میں شریک ہونا ہے، اسے صرف اپنے لیے زندہ نہیں رہنا بلکہ اپنے اہلِ ایمان بھائیوں کے لیے جینا ہے۔ وہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (الحجرات۴۹:۱۰) ''مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں'' پر ایمان رکھتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم، و من لم یصبح ناصحاً للہ و لرسولہ ولائمۃ المسلمین و عامتھم فلیس منھم [۸] جو شخص مسلمانوں کے

۸- اس حدیث کو طبرانی نے الصغیر (۱۳۱:۲) اور الاوسط (۲۷۰:۷) میں حذیفہ بن الیمان سے نقل کیا ہے۔ امام ہیثمی مجمع الزوائد میں کہتے ہیں کہ اس میں عبداللہ بن ابوجعفر الرازی آیا ہے جسے محمد بن حمید نے ضعیف کہا ہے۔ مگر ابوحاتم، ابوزرعۃ اور ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے مجمع الزوائد ج۱، ص۲۶۴۔

معاملے میں دلچسپی نہیں لیتا وہ ان میں سے نہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمان حکمرانوں اور عوام کے لیے خیر خواہی نہیں کرتا وہ ان میں سے نہیں۔

* **معاشی کفالت** : حدیث میں ہے: و ایما اهل عرصة بات فيهم امرؤ جائع فقد برئت منهم ذمة الله و ذمة رسوله[۹] جس آبادی (یا محلے) میں ایک شخص بھوکا رہ گیا، اس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ اٹھ گیا۔

قرآن کریم جیسا کہ ایک مسلمان کے لیے یہ بات فرض قرار دیتا ہے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلائے اسی طرح وہ اس پر یہ بھی لازم کرتا ہے کہ وہ دوسروں کو اس پر ابھارے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ وہ ان جاہلوں کی طرح نہ بنے جن کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مذمت بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الفجر ۸۹:۱۷-۱۸) ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے۔

قرآن کریم اس معاملے میں کوتاہی کرنے کو دین کی تکذیب کی ایک دلیل ٹھیراتا ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون ۱۰۷:۱-۳) تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔

سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور غریبوں اور کمزوروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے معاشروں

۹- اس حدیث کو امام احمد نے مسند (۴۸۸۰) میں ذکر کیا ہے۔ اس کے محققین کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے جس کی وجہ ابوبشر راوی کا مجہول ہونا ہے۔ اسے ابویعلیٰ نے بھی اپنی مسند (۱۰:۱۱۵) میں طبرانی نے الاوسط (۸:۲۱۰) میں اور حاکم نے المستدرك، كتاب البيوع (۲:۱۴) میں ذکر کیا ہے۔ امام ذہبی کہتے ہیں کہ عمرو بن حصین عقیلی کو محدثین نے متروک قرار دیا ہے۔ اصبغ بن زید جہنی کے بارے میں نرمی اختیار کی گئی ہے۔ ان حضرات نے اس حدیث کو ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ ہیثمی مجمع الزوائد میں کہتے ہیں کہ اسے احمد، ابویعلیٰ، بزار اور طبرانی نے الاوسط میں نقل کیا ہے۔ اس میں ابوبشر الاملوکی آیا ہے جسے ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (۴:۱۸۰)

میں یہ چیز انقلاب کی راہ میں روڑے اٹکانے اور مال دار کے خلاف غریب کی حمایت کرنے کی مترادف سمجھی جاتی ہے۔

* **سیاسی حمایت:** پھر جس طرح ایک مسلمان سے سماجی ظلم کا مقابلہ کرنے کو کہا گیا ہے اسی طرح اس سے سیاسی ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔ ظلم کا خواہ کوئی نام اور کوئی سی نوعیت ہو، اس پر سکوت اور سہل انگاری پوری امت کے لیے باعث عذاب ہے۔ ظلم کرنے والا اور اس ظلم پر خاموش رہنے والا دونوں یکساں مجرم ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّاتُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (الانفال ۸:۲۵) اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔

قرآن پاک نے ان قوموں کی مذمت کی ہے جنھوں نے جابروں اور سرکشوں کی اطاعت کی اور ان کے قافلے کے ساتھ شامل ہو گئے، جیسے قوم نوح کے بارے میں ارشاد ہے: وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا (نوح ۷۱:۲۱) انھوں نے اُن رئیسوں کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔

بلکہ محض ظالموں کی طرف جھکاؤ، میلان اور نفسیاتی رجحان کو بھی عذاب کا موجب قرار دیا ہے: وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (ھود ۱۱:۱۱۳) ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا، ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

اِسلام ہر مسلمان پر یہ سیاسی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایسی ریاست میں زندگی گزارے جس پر ایک مسلمان امام کتاب اللہ کی رُو سے حکومت کرتا ہو اور عوام نے اس کی بیعت کی ہو۔ اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو وہ اہل جاہلیت میں سے ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً (مسلم) جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں امام کی بیعت نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

دین وسیاست کی جدائی کے دعوے

کچھ لوگوں کا خیال بلکہ زعمِ باطل ہے کہ دین کا سیاست سے کچھ تعلق نہیں۔ ان لوگوں نے یہ جھوٹ تراشا ہے کہ سیاست میں کوئی دین نہیں اور دین میں کوئی سیاست نہیں۔ کمال یہ ہے کہ خود ان لوگوں نے دین کو اپنی سیاست کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ اپنے مذموم وادنیٰ مقاصد برلاسکیں۔ یہ لوگ علمِ دین کے لحاظ سے بعض کمزور حضرات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ اپنی باطل سیاست اور دنیوی لحاظ سے اپنی غلط پالیسیوں کے حق میں دینی نقطہ نظر سے من پسند فتویٰ لے سکیں۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ جب ہم ۱۹۴۸ء-۱۹۴۹ء میں جیل خانہ 'طور' میں تھے تو ہم پر..... جو قرآن کی حکمرانی اور اس نظام کے نفاذ کا مطالبہ کررہے تھے..... یہ فتویٰ جاری کیا گیا:

یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کررہے ہیں، زمین میں فساد پھیلا رہے ہیں، لہٰذا انھیں بھیانک طور پر قتل کردیا جائے یا صلیب پر لٹکایا جائے یا مخالف سمت سے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں یا یہ کہ انھیں ملک بدر کردیا جائے۔

حق پرستوں کے خلاف یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسا کئی بار ہوا ہے۔ اسٹیج اور کردار بدلتے رہے ہیں، ذہنیت و روش یہی رہی ہے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے اور عوام کو بھی یاد ہوگا کہ مفتیوں سے کہا گیا کہ وہ صہیونی ریاست کے ساتھ صلح کے جائز ومشروع ہونے کا فتویٰ صادر کریں، تاکہ ان کی شکست خوردہ پالیسی کی تائید ہوسکے۔ حالانکہ اس سے پہلے اسرائیل کے ساتھ صلح کے حرام ہونے کا فتویٰ جاری ہوچکا تھا اور اسرائیل کے ساتھ صلح کو اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کے ساتھ خیانت قرار دیا گیا تھا۔

اپنی مذموم سیاسی اغراض کے لیے حکام علما کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ ان سے بینک کے سود کے حلال ہونے اور اسی قسم کے دیگر مقاصد کے لیے فتویٰ لے سکیں۔ انھیں بعض ضعیف الایمان اور قلیل العلم لوگ مل ہی جایا کرتے ہیں مگر راسخ العقیدہ علمائے کرام ایسے فتاویٰ دینے سے

انکار کر دیتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا (الاحزاب ۳۳:۳۹) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اُسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

علامہ ابن قیمؒ نے امام ابوالوفاؒ ابن عقیل حنبلی سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

سیاست ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے لوگ صلاح و خیر کے زیادہ قریب اور فساد سے بہت دُور ہو جاتے ہیں، جب تک کہ سیاست، شریعت کے خلاف نہ ہو۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

عادلانہ سیاست، شریعت کی تعلیمات و ہدایات کی مخالف نہیں ہوتی بلکہ اس کے موافق ہوتی ہے بلکہ سیاست تو شریعت کے اجزا میں سے ایک جز ہے۔ ہم اسے 'سیاست' آپ حضرات کی اصطلاح کے تحت کہتے ہیں ورنہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل ہے[۱۰]۔

ہمارے علماے سلف نے سیاست کی قدر و قیمت اور اس کی فضیلت بیان کی ہے حتیٰ کہ امام غزالی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے:

دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دین دنیا کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، اقتدار اور دین جڑواں ہیں۔ دین اصل ہے اور اقتدار محافظ و پہرے دار ہے۔ جس کی اصل و بنیاد نہ ہو وہ گر جاتا ہے اور جس کا محافظ نہ ہو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔

'امامت' یا 'خلافت' کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ''یہ دین کی نگہبانی اور اس کے ذریعے دنیا کی سیاست میں صاحبِ شرع حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابتِ عامہ ہے''۔

پس معلوم ہوا کہ خلافت نگہبانی اور سیاست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ، معلّم اور قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست کار بھی تھے۔ آپؐ کے ہدایت یافتہ خلفا بھی سیاست کار تھے، اس لیے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہج و طریق پر چل رہے تھے۔ ان حضرات نے عدل و احسان کے

۱۰- الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة لابن قیم، ص۱۳-۱۵، مطبوعہ السنة المحمدیة

ساتھ امت کو درست راستے پر چلا کر سیاست فرمائی اور علم وایمان کے ساتھ امت کی قیادت کی۔

سیاست کی اس مسلمہ اہمیت کے باوجود ہمارے دور کے لوگ 'سیاست دانوں' سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ سیاست پر 'میکاولی' فکر کی گہری چھاپ، استعمار اور خیانت کار حکمرانوں، ظالموں اور آمروں کی سیاست ہے۔ شیخ محمد عبدہٗ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سیاست کاروں کے مکروفریب سے تنگ آ کر اپنا یہ مشہور قول کہا تھا: ''میں سیاست، سیاست کرنے والوں اور جن پر سیاست کی جائے، سب سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔'' فکرِ اسلامی کے مخالفین نے عوام کی سیاست دانوں سے اس نفرت کا فائدہ اٹھایا اور اس جامع وکامل نظامِ اسلام کے بارے میں جس کی طرف حامیانِ اسلام دعوت دیتے ہیں، کہنے لگے کہ یہ 'سیاسی اسلام' ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر مسلمان کو جو نفاذِ اسلام کے لیے کوشاں ہو، کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ 'سیاست دان' بنا ہوا ہے اور 'سیاست میں حصہ لیتا ہے'۔ اس چیز کو ان کی مذمت اور ان سے نفرت دلانے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ ایسا وقت بھی آئے جب مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کو 'سیاسی نماز' کہہ دیا جائے۔ سیرت ابن ھشام جیسی کتاب سے غزوات کے مطالعہ یا بخاری سے غزوات کے مطالعہ کرنے کو 'سیاسی مطالعہ' قرار دیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی کسی مخصوص سورہ کو 'سیاسی تلاوت' کہہ دیا جائے۔

❀……❀……❀